کلامِ غالب میں معنی خیزی کا عمل

Semantic Composition in Ghalib's Poetry

محمد راشد سعیدی [i]

Abstract:

Mirza Ghalib, the resonant and renowned poet of the sub-continent belongs to nineteenth century but he gets fame and significance in 20th century as well. If somebody tries to trace the supersede approach of Ghalib which made him prominence and unlocked his name for the 21st century, then he finds consciousness of the poetic diction that could be referred as barriers breaking. The age of Ghalib is distant to post- modernism, even, Hegel and Derrida were unknown for him, but the genuine probe on Ghalib's poetry enumerates the traces of negative dialect and deconstruction in his verses. In this research paper, the Poetry of Ghalib is studied in such a way that usage, causes, and effects of the above-mentioned theories in Ghalib Poetry can be clearly defined.

Keywords: *Ghalib, Deconstruction, Dialectics, Postmodernism, Interpretation, Meaning.*

مرزا غالب انیسویں صدی کے شاعر ہیں جن کا مقام و مرتبہ اکیسویں صدی میں بھی کسی طور کم نہیں ہوا۔ اگر غالب کے وقت کی قید سے آزاد ہو جانے کی منطق پر غور کریں تو جو چیز سامنے آتی ہے وہ ہے ان کا وقت کی حدود کو توڑتا لسانی شعور۔ غالب مابعد عہد سے قبل کے شاعر ہیں، ان کا کسی طور بھی ہیگل یا ژاک دریدا سے کوئی سابقہ نہیں پڑا۔ تاہم کلام غالب کے تجزیہ سے یہ حیرت انگیز بات سامنے آتی ہے کہ ان کی شعری بنت میں جدلیات نفی اور ردتشکیلی فکر کے نشانات اپنی تمام تر حرکیات کے ساتھ موجود ہیں۔ زیر غور تحقیقی پرچے میں کلام غالب کا مطالعہ اس طور کیا گیا ہے کہ مذکورہ نظریات کا غالب کے برتاؤ سامنے آ جائے اور یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ اس طرز کے لسانی شعور سے غالب نے کون سے مقاصد حاصل کیے۔

کلیدی الفاظ: غالب، معنی، ردّ تشکیل، جدلیات، مابعد جدیدیت، تعبیر۔

مرزا غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) اپنی ذات میں کلاسیکی، جدید اور مابعد جدید شاعر ہیں؛ جنھیں اُن کے وژن، فلسفیانہ سوچ، بلند پرواز تخیل، جدت طبع اور معنی آفرینی کے مسلسل عمل کی بنا پر کسی مخصوص زمانے، مخصوص تہذیب، جداگانہ کلچر یا تاریخ کے کسی خاص دور میں کسی خاص وقت کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ غالب تخلیقی سطح پر ایک دائمی زندگی حاصل کر چکے ہیں، ان کا کلام ہر عہد کے قاری کے لیے اُسی مطابقت سے معنی فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کسی شاعر کی دائمی حیات کے لیے یہ پیمانے متعین کرتے ہیں:

> ''کسی شاعر، ادیب یا تخلیق کار کی دائمی زندگی کا انحصار اِس امر پر ہے کہ اس کی وژن ایسی ہو کہ آنے والے زمانوں کے لوگ بھی اسے اپنی وژن سمجھیں۔ اُس کا تخیل اتنا ہمہ جہت ہو کہ مستقبل قریب بلکہ مستقبل بعید کے قارئین کے لیے بھی محرک کا کردار ادا کر سکے۔ اس کی سوچ / فکر / پیغام / فلسفۂ حیات / تصور کائنات ایسا جان دار ہو کہ گزرتے وقت کے

[i] لیکچرر، شعبہ اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور

باعث اُس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے بڑھتی رہیں۔ اُس کا اُسلوب ایسا طرح دار ہو کہ ادبی جمالیات کے متنوع تغیرات کا ساتھ دے سکے اور اگر اس کی راہنمائی کر سکے تو سونے پر سہاگہ۔"[۱]

ان افکار کو معیار مان لیا جائے تو غالب ہی ان پر پورے اترتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب نے ہر دور میں نقد و نظر کے پیمانوں کا ساتھ دیا، ان کی فکر نے ہر دور میں اپنی تازگی ظاہر کی اور ہر نظریۂ نقد نے اپنے تانے بانے کلام غالب میں تلاش کیے۔ غالب کے اشعار کی طرفیں کھلی ہوتی ہیں، اُن میں کوئی ایک معنی قید نہیں بلکہ معنی رواں ہیں، ہر قاری، مفکر اور نقاد کو ان میں اپنے افکار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دراصل خیالات و افکار کا یہی مسلسل بہاؤ غالب کی عظمت کا راز ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا شے ہے جس کے باعث کلام غالب اِس قابل ہوا کہ اُس میں سے اب تک معانی کے چشمے پھوٹ رہے ہیں؟ وہ کون سی فکر، فلسفہ، لسانی ہئیت یا خاص عمل تھا جس سے غالب نے اپنے کلام کو امر کر لیا؟ اگر غالب کے شعری تجربے کی جڑیں ہند اسلامی امتزاجی تہذیب میں گڑی تھیں تو غالب کے کسی زمانی و مکانی معاصر کے کلام کو وہ مقام کیوں نصیب نہیں ہوا جو کلام غالب کو ہوا؟ دوسرے شعراء جو عہد غالب کی فضا میں سانس لیتے اور سخن گوئی کرتے تھے، وہ تاریخ کا حافظہ بن چکے ہیں مگر غالب ہمیں آج بھی کیوں زندہ اور متحرک نظر آتے ہیں؟ بعض لوگوں کے نزدیک وحدت الوجود کی فکر غالب کے شعری تجربے کی اساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کے مطابق:

"اِس مضمون (وحدت الوجود) کو وہ ایسے یقین اور ایسی لذت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس کو غالب کا گمان نہیں بلکہ ایقان قرار دے سکتا ہے۔"[۲]

یہ حقیقت ہے کہ غالب کو وحدت الوجودی فکر سے دل چسپی تھی اور انہوں نے اس کو شعری تجربہ بھی بنایا۔ دراصل غالب کے ماحول اور احباب میں اِس فکر کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اُسلوب احمد انصاری کے مطابق:

"وہ (غالب) یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ تخیل کی آنکھ یا روحانی وسیلہ یا صیغہ ادراک کو مشاہدہ محض پر تفوق حاصل ہے۔"[۳]

غالب کے ماحول میں وحدت الوجودی فکر کی اہمیت اور غالب کی اس سے دلچسپی بجا، تاہم سوچنے

کی بات یہ ہے کہ کیا آج کا قاری کلام غالب میں وحدت الوجودی فکر تلاش کرتا ہے؟ کیا آج ہم غالب کو اس لیے دل چسپی سے پڑھتے ہیں کہ ہمیں اِس میں وحدت الوجودی فکر کی باریکیاں ملتی ہیں؟ در حقیقت وحدت الوجود کا فلسفہ ہماری گزشتہ تاریخ کا ایک زندہ تجربہ تھا مگر اب وہ فقط مطالعے کا موضوع ہے۔ اگر اب ہمیں غالب کا تجربہ اپنا تجربہ محسوس ہوتا ہے تو اُس کی وجہ وحدت الوجود کی فکر نہیں بلکہ غالب کا وہ شعری پیرایہ ہے جو ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم وحدت الوجود کو اُس کے متعین معانی کے علاوہ بھی مختلف امکانی پہلوؤں سے دیکھیں۔ دراصل غالب کو عظمت دینے والی، اُس کی طرزِ فکر اور اظہار کا پیرایہ ہی ہے۔ غالب کے تفکر کا اندازہ جو کہ مسلسل معنی آفرینی کا ذریعہ بھی ہے، اس کے اشعار میں بکھرا پڑا ہے۔ مختلف غالب شناسوں نے اُسے مختلف نام دیے اور اس فکر کی جڑیں مختلف فلسفوں سے ملائیں تاہم ہمارا تعلق اُن چند پہلوؤں سے ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مابعد جدیدیت سے میل کھاتے ہیں۔

قبل جدیدیت سے مابعد جدیدیت کے عہد تک آتے آتے سچائیوں کی نوعیت بھی تبدیل ہو گئی ہے۔ آج کے دور میں وہ شعری متن ہماری فکر کو انگیخت کرتا ہے جو نظام کائنات سے متعلق ہمارے تصورات کو وسعت دے۔ غالب اپنے اشعار میں ایک ایسی تصوراتی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں جو ہماری حقیقی دنیا سے متعلق ہمارے تصورات کو روشن کرتی ہے۔ اِس میں کوئی کلام نہیں کہ غالب کا شاعرانہ خیال، ہمارا تجربہ ہے۔ غالب کی فنتاسی میں ہمیں اپنی دنیا کی سچائیوں کا سراغ ملتا ہے، مگر یہ غالب کی شاعری کی نصف صداقت ہے۔ غالب ہماری دنیا سے متعلق ہمارے فہم میں فقط گہرائی ہی نہیں ارتفاع بھی پیدا کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دنیا سے مزید وابستہ ہونے میں مدد ہی نہیں دیتے، اسے ایک ارفع سطح پر تجربہ کرنے کی راہ بھی سجھاتے ہیں۔[۴] غالب کی یہ خصوصیت کسی مخصوص نظریے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی استفہامیہ فکر اور طرز استدلال کی وجہ سے ہے۔ غالب نفی و اثبات کو بہ یک وقت پیش کرتے ہیں۔ موجود کی نفی اور وجود کی وحدت کا اثبات، دوسروں کے علم و تجربے کی نفی اور اپنے خیال کا اثبات۔ غالب کی اِس خصوصیت کو کسی نے متضاد رویہ کہا ہے تو کسی نے اسے قول محال (Paradox) سے تعبیر کیا ہے اور اسی رویے کو کلام غالب میں معنی آفرینی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ دراصل یہ غالب کی فکر میں جدلیاتی کیفیت ہے۔ اِسی جدلیاتی وضع کے باعث موجود اور معلوم میں سے نامعلوم تک رسائی کرتے اور اس حقیقت کو اپنے قاری پر بھی وا کرتے

ہیں جس سے معنی خیزی کا عمل مستقل جاری رہتا ہے، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی معتبر تصنیف غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات اسے جدلیات نفی کا نام دیتے اور اسے غالب کی بنیادی فکر تک رسائی کی کلید سمجھتے ہیں:

> "دیکھا جائے تو یہ نفی محض نہیں ہے بلکہ مرکب ذہنی عمل سے مثبت ادراک کی توثیق ہے غیر مثبت کے استثنا سے۔ غالب کی شعریات میں یہ حرکیات اکثر و بیشتر کار گر ہے جس سے نفی در نفی کا پیچیدہ تعامل اور اشکال پیدا ہوتا ہے جو معنی آفریں تو ہے ہی جمالیات کے نقطہ نظر سے حسن آفریں بھی ہے۔"[۵]

جدلیاتی فکر عہد حاضر کے مابعد جدید ذہن کو بہت راس آتی ہے۔ نئی علمیات اور شعریات سب سے زیادہ زور معنیاتی تکثیریت، تجسّس اور بوقلمونی پر دیتی ہے اور جدلیاتی فکر بھی آزادگی و کشادگی اور مختلف طرفوں کو کھلا رکھنے پر زور دیتا ہے جو مابعد جدیدیت کا خاصہ ہے۔[۶] غالب اپنی جدلیاتی وضع کی مدد سے چیزوں کو نفی سے بھی اثبات کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ وہ ظاہراً اپنے اشعار میں اشیا کی نفی کیے جاتے ہی تاہم زیریں سطح پر اُن کی نفی کئی اشیا کا اثبات کرتی اور کہیں تاریک پہلوؤں پر سوالیہ نشان ڈال کر قاری کو انہیں روشنی میں لانے پر آمادہ کرتی ہے۔ مابعد جدید تنقید میں جب کسی متن کو داخلی طور پر پرکھا جاتا ہے تو اُس کے اندر موجود شعریات کو جدلیات کے اصولوں کے مطابق دیکھا جاتا ہے۔ الفاظ اپنے تضادات کی بنا پر معنی دیتے ہیں جب کہ غالب کے ہاں معاملہ کچھ یوں ہے کہ غالب نے شعوری سطح پر اپنے اشعار میں جدلیاتی طرز کو برتا ہے جس سے اشعار کے معانی میں کثرت پیدا ہو گئی ہے۔ غالب کے ہاں جدلیاتی فکر کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے جدلیات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

اگرچہ جدلیات مابعد جدید فکر کے بے حد قریب محسوس ہوتی ہے تاہم جدلیات کی تاریخ فلسفے کی روایت میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ ہیگل کی جدلیات کی شہرت کے بعد مارکس کی مادی جدلیات نے ایک باقاعدہ موضوع کا درجہ اختیار کر لیا، تاہم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مطابق جدلیاتی فکر دانشِ ہند کا خاصہ ہے اور اسے ہزاروں سال سے مطالعاتی موضوع اور طریق مطالعہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان کے تین مذاہب ہندو، جین اور بدھ مت کے مفکرین کے ہاں جدلیات منطقی رویے اور اہم موضوع

کے طور پر مستعمل رہی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نزدیک مغربی فکریات اور علمیات میں جدلیات اور دریدا کے نظریۂ ردّ تشکیل کی موجودگی، اہل مغرب کی دانش ہند سے خوشہ چینی کا ثبوت ہے۔[۷]

اِس بات سے قطع نظر کہ جدلیات کا اصل ماخذ کیا ہے، یہ ایک دلچسپ فکری رویہ ہے جو اپنے طور پر کسی بھی متن میں معنوی جہان دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اِس کی وجہ سے کسی بھی حقیقت کی کئی پرتیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہیگلیائی جدلیات ہی کی بنیاد پر دیکھیں کہ؛ ہر دعویٰ (Thesis) اپنے ہی اندر ایک ردِّ دعویٰ (Anti Thesis) جن کے باہمی ٹکراؤ سے ہی ادغام (Synthesis) وجود میں آتا ہے۔ اس نکتے کو آسانی سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے زبان میں کسی بھی شے کا تصور اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ضد کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ یعنی پہلی حقیقت کا انکار ہی دوسری حقیقت کا اثبات بنتا ہے اور اسی طرح دوسری حقیقت کا وجود پہلی حقیقت کے وجود کا بھی اثبات کر رہا ہوتا ہے۔[۸]

اپنی نوعیت کے لحاظ سے جدلیات ایک منفی رویہ ہے جو اپنی منفیت میں بھی اثبات کے پہلو رکھتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہر بیان کسی نہ کسی حقیقت کی دلیل ہوتا ہے تو منفی بیان بھی اِسی طرح کسی نہ کسی حقیقت کی دلالت کرتا ہے اور حقیقت کسی نہ کسی شے یا صورت حال کا اثبات ہوتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ: "گلاس میں پانی ہے" تو ہم ایک حقیقت کا انکشاف کر رہے ہوتے ہیں لیکن جب ہم کہتے ہیں: "گلاس میں پانی نہیں ہے" تو ہم غیر موجودگی کو منفی طور پر نہیں دیکھ رہے ہوتے۔ جدلیات میں منفی بیان چاہے کتنا ہی منفی کیوں نہ ہو وہ کسی نہ کسی معروض کا اثبات کر رہا ہوتا ہے۔ منفی بیان کی درست تفہیم کے لیے نفی کی نفی درکار ہوتی ہے، کیوں کی نفی کی نفی اثبات کو ظاہر کرتی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ "گلاس میں پانی ہے"، تو جدلیات کی رو سے گلاس میں پانی کی موجودی ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ عدم بھی ثابت ہوتا ہے جب ہم کہتے ہیں کہ "گلاس میں پانی نہیں ہے" تو جدلیات اِس منفی جملے سے موجودگی کا اثبات بھی کرتی ہے اور اِس کے ساتھ کئی اور امکانات کی بھی حامل ہو سکتی ہے، مثلاً:۔

(۱) گلاس میں سے پانی پی لیا گیا ہے۔ (۲) گلاس میں پانی موجود تھا۔
(۳) پانی گلاس میں نہیں جگ میں ہے۔ (۴) کسی نے پانی پی لیا ہے۔
(۵) کس نے پانی پیا؟

(۶) اب پانی کی ضرورت ہے مگر پانی موجود نہیں۔

(۷) گلاس اِس لیے خالی ہوا ہے کہ اُس میں موجود پانی سے پیاس بجھائی گئی ہے۔

(۸) گلاس میں موجود پانی گر گیا ہوگا، علیٰ ہٰذا القیاس۔

گویا جدلیات معانی میں حرکت پیدا کر دیتی ہے جس سے معنی بہنے لگتے ہیں اور واحد معنی اپنی وحدت کھو دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مطابق:

> ''گویا جدلیات نفی معنیات کے معاملے میں حد درجہ حرکیاتی (Dynamic) کردار ادا کرتی ہے اور یک گونہ حرکیات میں بدل جاتی ہے جو بجنسہٖ پُر قوت ہوتی ہے۔ زبان ویسے ہی Referential (حوالی جاتی) نہیں Differential (افتراق) ہے اور 'افتراقیت' اور 'التوا' کا کھیل کھیلتی ہے، حرکیات نفی کے مَس سے یہ تفاعل مزید خود نگر (Self-reffexive) ہو جاتا ہے اور نہ صرف معنی فرسودہ (معمولہ، پیش پا افتادہ) بے دخل ہو جاتا ہے بلکہ معنی غریب وغیرہ متعین بھی ہو جاتا ہے یا عرف عام میں معنی کی طرفیں کھل جاتی ہیں۔''[۹]

جدلیات کسی بھی متن میں معنی کے التوا اور کثیر امکانات کی وجہ سے نئی جہتیں پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو جدلیاتی فکر دریدا کی افتراقیت کے بے حد قریب ہے۔ دریدا متن میں معنی کے افتراق مسلسل اور التوائے مسلسل کی بات کرتا ہے کیوں کہ افتراق و التواء کے بغیر اشیا کی پہچان ممکن نہیں، اِسی افتراق باہمی کی وجہ سے معنی پاشی (Dissemination) کا عمل ممکن ہوتا ہے۔ جدلیاتی وضع بھی متن میں افتراق و التوا کی صورت حال پیدا کر دیتی ہے جس سے معنی کے امکانات کھلتے جاتے ہیں۔

غالب کی شعریات میں اِسی جدلیاتی رویے کی وجہ سے معنی غیر معین رہتے ہیں۔ جدلیاتی فکر سے آشنائی کے بغیر غالب کی درست تفہیم ممکن نہیں۔ غالب کے ہاں خیالات کی نفی در نفی کا ایک سلسلہ موجود ہے جو نئی نئی جہتوں سے نئے نئے معنی پیدا کرتا رہتا ہے۔ غالب کی فکر میں جدلیت بطور جوہر کے کام کرتی ہے اِسی لیے غالب کے سامنے ہر تصور حرکیات نفی میں گندھ اور تُل کر سامنے آجاتا ہے جسے وہ اپنے اشعار میں تجسیم کرتے جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ غالب نے جدلیات کو باقاعدہ فکر کے طور پر پڑھا نہیں تھا نہ ہی کسی واضح ماخذ سے اِس کو پرکھا تھا مگر پھر بھی جدلیات اور جدلیاتی فکر کا کلام غالب میں بہت زیادہ

استعمال تعجب انگیز ہے:

بَر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حُسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
(دیوانِ غالب کامل: ص ۱۵۵) [۱۰]

پہلے شعر میں آئینہ عالم حیرت کا استعارہ ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ فیضان غیب کا پر تو بروئے شش جہت یعنی سارے عالم پر کھلا ہے، لیکن عام و خاص اور ناقص و کامل سب حیرت میں ڈوبے ہوئے ہیں نیز حقیقت کی عدم واقفیت میں سب ایک جیسے ہیں یعنی حقیقت کی نوعیت کے ادراک کے لیے زبان گنگ اور عقل و دانش بے بس ہے۔ چنانچہ عارف و جاہل کا امتیاز اِس معاملے میں اپنی بے خبری کی وجہ سے بے معنی ہے۔ شوق کا کمال یہ ہے کہ وہ ہمہ تن دید ہو جائے جس سے نقاب حُسن کے بند کھل جائیں گے لیکن غالب کی باریک بین نظر نے اِس سادہ بات میں جدلیات کو عمل میں لا کر شعر کی معنویت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ حُسن بے حجاب کا جلوہ ''نگاہ'' کو ہی میسر ہوتا ہے لیکن غالب کہتے ہیں کہ حسن بے حجاب تو میسر ہے میسر اس کے نظارے میں 'غیر از نگاہ' کوئی اور حائل نہیں۔ یہاں غالب نے 'غیر' اور 'حسن' کے ذریعے دوہری نفی استعمال کی ہے جس سے شعر عجب نکتہ آفرینی اور لطافت کا حامل ہو گیا ہے۔ غیر از نگاہ کوئی حائل نہیں یا اب صرف نگاہ حائل ہے، ہر دو باتوں کا معنی ایک نہیں۔ پہلے کلمے میں تفاعل نفی نے جو رکاوٹ (Resistance) اور اس کے نتیجے میں شدت پیدا کی ہے، دوسرا مثبت کلمہ وہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے ساتھ، نگاہ جو غیر مرئی ہے اُسے غالب نے مرئی کرکے دکھایا ہے۔ گویا وہ کوئی غیر شے ہے جسے نقاب اٹھنے کے بعد وہاں نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں غالب کی طبیعت میں موجود جدلیات نے ''نگاہ'' کو غیر بنا کر نکتہ آفرینی کی ہے۔

غالب کا ذہن اکثر و بیشتر جدلیات نفی کے مدّ و جذر کے ذریعے متعین معنی کو متحرک کر دیتا ہے جس سے روایتی معنوں کی تقلیب ہو جاتی ہے۔ کلام غالب سے جدلیات نفی کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

سمجھا ہوا ہوں عشق میں نقصاں کو فائدہ
جتنا کہ نا امید تر، امیدوار تر
(دیوانِ غالب کامل، ص ۱۴۷)

اِس شعر کے دونوں مصرعوں میں نفی کا تفاعل موجود ہے جس سے روایتی معانی پلٹا کھا گئے ہیں۔ عشق میں ذلت و رسوائی بھی سعادت شمار کی جاتی ہے۔ یعنی عشق میں نقصان بھی فائدہ سمجھا جاتا ہے یہاں تک معانی روایتی ہے، مگر اِس کے بعد غالب کی خلّاقی سامنے آتی ہے کہ جتنا زیادہ ناامید ہوتا جاتا ہوں اتنا زیادہ خود کو امیدوار سمجھتا ہوں۔ شعر کا اصل مزہ ناکامی کو کامیابی میں بدلنے اور ناامید تر اور امیدوار تر کی کشاکش نفی میں ہے۔ لفظوں کے روایتی معنی کو پلٹنا اور پلٹے ہوئے معنی کو دلیل شعری کے طور پر استعمال کرنا اور نئے معنی قائم کرنا غالب کا خاص انداز ہے۔

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(دیوانِ غالب کامل: ص ۱۷۵)

اجابت یعنی قبولیت اور دعا نہ مانگنے میں رشتہ نفی ہے۔ اسی طرح دل بے مدعا بھی نفی اساس ہے اور ردیف 'نہ مانگ' بھی نفی ہی ہے۔ دعا کی قبولیت کا یقین ہو تو دعا نہ مانگی جائے اور صرف دل بے مدعا کی دعا کی جائے مگر دل بے مدعا مانگنا بھی تو دعا ہی کی صورت ہے اسی لیے یہ دعا بھی نہ مانگی جائے۔ اس شعر کی تشکیل میں بھی نفی کی پیچ در پیچ گردش کو استعمال میں لایا گیا ہے۔ دوسرے معروف شعر میں بھی جدلیاتی کشاکش کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ داغ حسرتیں پوری نہ ہونے کا استعارہ ہے اور خدا کی طرف سے گناہوں کا حساب مانگنے پر وہ حسرتیں یاد آ جاتی ہیں۔ یعنی جدلیات کی رو سے گناہوں کی تعداد بھی زیادہ ہے، حساب مانگنے سے گناہ اور حسرت دونوں یاد آ جاتے ہیں۔ اِسی طرح غالب کے ایک اور شعر میں جدلیاتی وضع کو استعمال میں لاتے ہوئے گناہوں کی ماہیت ہی بدل دی گئی ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۲۲)

اس ضرب المثل میں کردہ گناہوں اور ناکردہ گناہوں کے باہمی تضاد کو واضح کر کے نئے معانی پیدا کر لیے گئے ہیں۔ ناکردہ گناہوں اور حسرت کی داد کی طلب نے کردہ گناہوں کی سزا کے خوف کو قدرے کم کر دیا ہے اِس طرح گناہ کے تصور کی ردّ تشکیل ہو گئی ہے۔

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۸۹)

غالب کے اِس شعر میں بھی جدلیاتی فکر کے معمولہ حقائق کو پلٹ کر نئی صورت حال پیدا کرنے کے عمل کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ دوستی، بیگانگی اور منہ چھپانا چھوڑنے میں افتراق کا رشتہ ہے۔ محبوب عدم التفات کے اظہار کے لیے بیگانگی ظاہر کرتا ہے اور منہ چھپانے لگتا ہے، غالب کہتے ہیں بیگانگی اور منہ چھپانے سے لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا اگر واقعی مقصود بیگانگی ہے تو منہ چھپانا چھوڑ دیا جائے اور التفات کا مظاہرہ کیا جائے۔ اِسی غزل کے ایک اور شعر میں جدلیاتی افتاد قدرے واضح طور پر موجود ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اُس کی دیکھا چاہیے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۸۹)

اس شعر میں غالب کی لاشعوری تخلیقی رو میں جدلیاتی عمل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اِس شعر میں تشکیل اور رد تشکیل دونوں کے عمل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اصل میں امید کے معنی کو نا امیدی سے اور نا امیدی کو امید کے معنی سے پلٹ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں فریب ہستی کے متعلق جدلیاتی طریقے سے صورت حال وضع کی گئی ہے۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۹۰)

'ہاں' اور 'مت' میں موجود افتراق فریب ہستی کھانے کے طرف راغب بھی کر رہا ہے اور روک بھی رہا ہے، اِسی طرح 'ہے' اور 'نہیں ہے' میں جدلیاتی افتاد معنی التوا کو بڑھا کر حقیقت کے نئے در کھول دیتی ہے۔ اِسی طرح کے مزید اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں
جُز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

(دیوانِ غالب کامل: ص ۳۰۰)

ان دونوں اشعار میں ایک طرف وحدت الوجودی فکر کے آثار نظر اٹے ہیں تو دوسری طرف ہندومت کے مایا نظریے کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم جدلیاتی فکر ہمیں انکار میں اثبات اور 'ہاں' میں 'ناں' کو جلوہ گر دکھاتی ہے جس سے غالب کی فکر متصوفانہ نہیں بلکہ منطقی انداز کے زیادہ قریب لگتی ہے۔ غالب کسی موجودہ نظریۂ حقیقت کے اثبات کی بجائے حقیقت کی کھوج کے لیے اشارے فراہم کرتے ہیں۔ اُسلوب احمد انصاری کے مطابق:

> "طنز، نکتہ سنجی، استعادہ یعنی Paradox اور استفسار کا لب و لہجہ اس لیے بھی ہے کہ اس میں ایک طرح کی تفتیش اور جستجو کے محرکات پائے جاتے ہیں۔ اجمالی لیکن کسی حد تک حتمی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس میں غالب کا سروکار Given سے نہیں بلکہ Possible سے بھی ہے۔ ان کی توجہ نہ صرف اس پر ہے جو نظروں کے سامنے عیاں ہے، متعین ہے اور تسلیم شدہ ہے بلکہ اس پر بھی کچھ کم نہیں جو نظروں سے پوشیدہ ہے لیکن حیطۂ امکان میں ہے اور تجسّس کے داعیے کو اکساتا ہے۔"[۱۱]

غالب کا سفر نا معلوم کی جانب ہے، اس سفر کے دوران میں وہ اپنے نظریات کو متعین کر کے لاگو نہیں کرتے بلکہ تلاش حقیقت اور معنی آفرینی کی جہت کو واضح کرتے ہیں۔

نہیں گر سرو و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

(دیوانِ غالب کامل، ص ۳۶۴)

غالب کے اشعار کی تشکیل میں اکثر اوقات معمہ کی سی کیفیت ہوتی ہے، جس میں جدلیاتی عمل کے ذریعے ایک معنی کے دوسرے معنی رد کرنے سے ایک ایسا جدلیاتی عرصہ حاصل ہوتا ہے جو لاینحل رہتا ہے، اس میں معانی کی اِتنی جہتیں ہوتی ہیں کہ کوئی ایک تعبیر اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(دیوانِ غالب کامل، ص ۱۶۸)

غالب کے اِس شعر میں بھی طرفیں کھلی رہنے کے باعث کئی تعبیریں ممکن ہیں۔ سراپا رہن عشق ہونے سے الفت ہستی کی نفی ہوتی ہے۔ الفت ہستی یعنی جب اپنی جان پیاری ہو تو عشق میں حقیقت ہونا

ممکن نہیں۔ اِسی طرح ان دونوں کا بہ یک وقت ہونا بھی ممکن نہیں، جیسے کہ کوئی برق کی پرستش کرے اور خرمن کے جلنے پر افسوس بھی۔ یہ حقیقت متناقضہ ہے، انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ راہ تباہی کی طرف جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ اُسی راہ پر چلتا ہے۔ ہر چیز منطقی نہیں ہوتا، ہر چیز کی آسان توجیہہ بھی ممکن نہیں ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

(دیوانِ غالب کامل، ص۱۴۹)

غالب نے اس شعر میں اشیا کے باہمی تضاد اور ان کی باہم موجودگی کو ظاہر کیا ہے۔ لطافت اور کثافت باہم متضاد ہیں۔ تاہم ایک کا تصور دوسری کے بغیر ممکن نہیں۔ تاہم لطافت جسے روایتی معنوں میں اپنے طور پر مکمل سمجھا جاتا ہے بقول غالب یہ کثافت کے بغیر اپنا جلوہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اِس بات کی توجیہہ دوسرے مصرعے میں دی گئی ہے کہ جہاں آئینہ ہو وہاں زنگار یعنی کثافت لازم ہے، سو باد بہاری کے آئینے میں چمن کی حیثیت زنگار کی سی ہے۔ جدید لسانیات میں جہاں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ الفاظ اپنے تضادات کی بنا پر اپنا اثبات کرتے ہیں وہیں غالب بہت عرصہ پہلے اِس بات کا اظہار کر رہے ہیں۔ لطافت اپنے متضاد تصور یعنی کثافت کی بنا پر اپنا وجود رکھتی ہے، اِس کے بغیر اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔

وارستہ اِس سے ہے کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی، بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں — اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۵۹)

ان اشعار میں ردیف 'کیوں نہ ہو' ایک خاص برقیاتی عمل پیدا کر رہی ہے جس سے پچھلے الفاظ کی طرف فوراً دھیان پلٹ جاتا ہے۔ حرکیات نفی معنوں کی تقلیب کر دیتی ہیں۔ محبت اور عداوت نفی کی وجہ سے بے معنی ہو گئے ہیں اصل اہمیت 'کرنے' کو حاصل ہو گئی جو حقیقت میں محبوب کے ساتھ تعلق کا ذریعہ ہے

ہے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

(دیوانِ غالب کامل، ص۲۵۱)

تصوف میں فنا کا مرحلہ بہت مشکل تصور کیا جاتا ہے مگر غالب کہتے ہیں کہ یہ دشوار ترین کام بھی آسان نکلا۔ اِسی طرح ایک اور شعر میں اِسی بات کو وضاحت سے پیش کیا ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر انساں ہونا

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۸۶)

وہاں فنا جیسا مشکل کام بھی آسان تھا جبکہ اِس شعر میں آسان کام کا ہونا بھی مشکل دکھایا گیا ہے۔ اِس شعر میں دو کاموں کا مشکل ہونا دکھایا گیا ہے، مشکل کام کے آسان اور آدمی کے انسان ہونے کا۔ اِس شعر میں جدلیاتی عمل معانی کو رفعتوں تک لے جاتا ہے۔ یہ تو عام بات ہے کہ دنیا میں ہر کام آسان نہیں ہوتا مگر یہ بات عجیب ہے آدمی جو بہ ظاہر انسان ہے، کا انسان بننا دشوار ہو۔ دریدا جو افتراق لسان پر یقین رکھتا ہے، اُس کے نزدیک لفظ واحد معنی ممکن نہیں یعنی مترادف بعینہٖ اصل لفظ جیسا معنی نہیں لاتا، آدمی کا مترادف اگر انسان ہے تو یہ بھی باہمی فرق کے حامل ہوں گے۔ آدمی سے غالب کی مراد نوع (Genre) ہے اور انسان کے ساتھ انسانیت (Humanism) کا تصور موجود ہے جو ان دونوں کو ایک جیسا نہیں ہونے دیتا ہے۔ غالب نے اپنی جدلیاتی افتاد کی مدد سے یہ پردہ اٹھایا ہے کہ ہر آدمی انسانی ہمدردی کے جذبے کا حامل نہیں ہوتا۔ غالب کا کمال یہ کہ وہ اپنے شعری متن میں دہرے مطالب کا اہتمام کرتے ہیں۔ پہلے یہ دو مطالب اپنے اپنے طور پر معانی فراہم کرتے ہیں بعد ازاں جدلیاتی کشاکش سے ایک دوسرے کے معنی کا انہدام کرکے کئی نئے معانی کے لیے در وا کرتے ہیں۔ ذیل میں ایک غزل پیش خدمت ہے جس کے ہر شعر میں باہمی تضاد و افتراق اور جدلیاتی وضع سے معنی آفرینی کا عمل ہو رہا ہے۔

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا جذبہ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

(دیوانِ غالب کامل: ص ۲۵۱)

اس غزل کے ہر شعر میں متضاد اشیاء کی کشاکش دیکھی جا سکتی ہے۔ نفی در نفی کا طریقہ اشعار کو معنویت سے لبریز کر دیتا ہے۔ نیکی اور جفا، کھنچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے، نہ پوچھا جانا، نہ بولا جانا، ناامیدی

کے دوران سنبھلنے کی Resistance، نظارہ دیکھنا پھر اُس دیکھنے کو ظلم جاننا، بھاگنا اور ٹھہرنا یہ تمام جدلیات نفی کا منظر پیش کرتے ہیں، اور آخری شعر میں کافر اور خدا کے مابین افتراقیت بھی معنی خیز ہے۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۵۶)

عشق کی غارت گری نے گھر کے گھر ڈھا دیے ہیں، اب دل میں حسرت تعمیر کے علاوہ کچھ نہیں۔ دوسرے مصرعے میں حسرت تعمیر اور خاک میں جدلیاتی کشاکش موجود ہے۔ گھر کی تعمیر فقط اینٹ، چونے، گارے اور مٹی سے ممکن نہیں ہے، مگر گھر میں خاک نہیں، محاورتاً کچھ بھی نہیں۔ مٹی تعمیر کا استعارہ ہے جس کا حسرت تعمیر سے جدلیات نفی کا رشتہ ہے۔ اِسی طرح یہ شعر دیکھیے:

گھر میں تھا کیا ترا غم جسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۸۶)

غالب اپنے اشعار میں نفی کا پیچ ڈال کے استفہام پیدا کر دیتے ہیں جس سے قاری کے ذہن میں معنویت ابھرتی جاتی ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۹۲)

غالب کے اِس شعر میں جدلیاتی وضع معنی آفرینی کے عمل کو ارفع کر دیتی ہے۔ بظاہر سادہ اشیا بھی سادہ نہیں ہوتیں۔ اشیا وہ ہیں ہی نہیں جو نظر آتی ہیں۔ ہاں میں نہیں پوشیدہ ہوتی ہے اور نہیں میں ہاں۔ ہر تعمیر میں تخریب مضمر ہے اور تخریب میں تعمیر۔ اشیا کی بنیادوں کو جانچنا اور حقیقت کو تہہ در تہہ اور جہت در جہت دیکھنا غالب کا کمال ہے اور وہ اِسے نفی در نفی سے ممکن بناتے ہیں۔ بجلی جو خرمن پر گری ہے خرمن سے الگ نہیں ہے۔ ہر شے منحصر بالغیر ہے۔ دہکاں کے خون گرم نے خرمن کو پیدا کیا چنانچہ اس کے عدم کا امکان بھی پیدا ہو گیا۔ یہ شعر جہاں مابعد جدیدیت کے دہرے تجانس (Binary Opposit) کے قریب تر ہے وہ تشکیلی حقیقت (Hyperreality) اور (Reality) کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

(دیوانِ غالب کامل، ص ۲۹۸)

اس شعر میں بھی ہوس اور نشاط میں جینے اور مرنے میں افتراق جدلیات واضح ہے جو معنی خیزی کا باعث ہے۔ زندگانی ہوس کاری سے عبارت ہے۔ کون جینا نہیں چاہتا اور موت سے بچنا نہیں چاہتا۔ تاہم زندگی کی نشاط اِسی وجہ سے ہے کہ حصول نشاط کی مہلت کم ہے۔ موت زندگی کا اختتام ہے، یہ بات واضح ہے، تاہم غالب جینے کے مزے کو موت کے آنے سے مشروط کرکے موت کو زندگی کی معنویت عطا کرتے ہیں:

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذّت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

(دیوانِ غالب کامل، ص ۳۰۲)

اِس شعر میں مرزا غالب نے نفی در نفی کا عجب سلسلہ قائم کر دیا ہے، 'ہجوم ناامیدی'، 'خاک میں ملنا' اور 'سعی بے حاصل' تینوں منفی پیکر ہیں۔ خیالی لذت اندوزی مرکزی پیکر ہے۔ غالب کے نزدیک سعی اگرچہ بے حاصل ہے مگر لذت سے معمور ہے۔ اِس شعر کو بہ غور دیکھنے سے ایک بات کھلتی ہے کہ نا امیدی کے 'نا' اور بے حاصل کے 'بے' یعنی ان دونوں منفی الفاظ کا ایک دوسرے سے ردّ کر دیا گیا ہے۔ یعنی نفی کا رد نفی کے ذریعے۔

فکر و خیال کی بلندی اور تخیل کا ایک لازمی شعریاتی ثمر 'لسانی ہئیت' ہے۔ غالب کی شاعری کا ایک بڑا حصہ کسی مشاہدے کا عکاس یا کسی نظریے کا ترجمان ہونے کی بجائے ایک لسانی ہئیت ہونے پر زور دیتا ہے۔ ایسی لسانی ہئیت جس کی تفہیم کے لیے باہر جانے کی بجائے اندر جھانکنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ غالب کی لسانی ہئیت ان کی اپنی شعری و فکری کائنات کی حامل ہے، جس میں پیچیدہ دعائیں، نسبتیں اور محاکات گہری بصیرتوں کا انکشاف کرتی ہیں۔ کلام غالب کی لسانی ہئیت مابعد جدید فکری نظام سے خصوصی نسبت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے مطابق:

"شاید ہی کسی دوسرے اردو شاعر کے یہاں اس حقیقت پر زور ہو کہ شاعرانہ معانی کا سرچشمہ زبان ہے۔ یہ امر نئی تنقیدی تھیوری کے اس موقف سے ملتا جلتا ہے کہ تمام

ثقافتی معانی زبان میں لکھے ہوئے ہیں اور زبان حقیقت کی عکاسی کرنے سے زیادہ اسے تشکیل دیتی ہے۔ حقیقت وہی ہے جسے ہم زبان کے اندر اور زبان کے راستے سے دریافت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں نقش، تحریر اور تمثال تواتر کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"[۱۴]

غالب کے ہاں معنی خیزی کا پورا نظام متضاد اور افتراقیت سے بھرپور الفاظ کے ہیر پھیر سے طے پاتا ہے۔ ان الفاظ میں ردّ در ردّ اور نفی در نفی سے غالب عمومی باتوں سے خصوصی مطالب نکالتے ہیں۔ ذیل میں دی غزل ملاحظہ کیجیے:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۰۹)

اس غزل کے اکثر اشعار میں تمثال کاری کے کرشمے دیکھے جا سکتے ہیں۔ غالب کا معنی آفرینی کا ڈھنگ کمال کا ہے۔ محبوب کے پاؤں جو زمین پر پڑتے ہیں، غالب نے انہیں برقیانے کے عمل سے گزار کر متحرک کر دیا جواب گل کتر رہے ہیں۔ اِسی طرح نظارے کو بھی نقاب کے معنوں میں لینا، جس سے نگاہ رخ پر بکھر جاتی ہے، غالب ہی کا کمال ہے۔

غالب کی تشکیل شعر کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اکثر سامنے کے لفظوں کو گردش میں لا کر سیال بنا دیتے ہیں جس سے اُن کی قطعیت غائب ہو جاتی ہے:۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۲۱)

اِس شعر میں غالب نے دو عام اسمائے فعلیہ 'لگاؤ' اور 'ناؤ' اور ان کے تلازمات شعری کے مابین تناؤ دکھا کر عجب معنی خیزی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ غالب کے اشعار میں جستجو کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اگر اشعار میں نفی در نفی ہے تو وہ بھی ایک استفہامیہ رویہ پیدا کرتی ہے جب کہ باقاعدہ تو واقعتاً حقیقت کی کھوج کی علامت ہے۔ استفہام میں کسی نظریے یا نقطے کا صریحی انکار موجود ہوتا ہے اور انکار کی صورت اُس نظریے پر سوالیہ

نشان ثبت کر دیتی ہے جس سے وہ متن استفہامیہ متن (Interrogative Test) بن جاتا ہے۔ کیتھرین بیلسی کے مطابق:

> "استفہامیہ متن واحد نقطۂ نظر کا انکار کرتا ہے، خواہ یہ نقطہ نظر کسی پیچیدہ اور جامع ہو مگر (جہاں تک) نقطہ ہائے نظر (کا تعلق ہے ان) کو نا قابل حل ٹکراؤ اور تضاد میں یک جا کرتا ہے۔"[۱۳]

غالب کے متن میں تضادات، انکار و استفہام موجود نظریات اور معانی کو پس پشت ڈال کر نئے معانی کی کھوج کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ درج ذیل پوری غزل میں یہی کیفیت ملتی ہے:۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

(دیوانِ غالب کامل: ص ۳۲۴)

یہ قطعہ بند اشعار غالب کے ذہنی تجسّس اور باطنی خلفشار کے مظہر ہیں۔ وجود کی نوعیت و ماہیت کے بارے میں سوال اٹھانا، روایتی عقائد کی تقلیب کرنا اور پوشیدہ معانی تک رسائی حاصل کر کے انہیں ظاہر کرنا غالب کی ذہنی ساخت کا حصہ ہے۔ اشعار کا حُسن جدلیاتی کشمکش، استفہامیہ انداز اور تمثال کاری میں ہے۔ غالب ایسے سوال اٹھاتا ہے جس کا جواب کوئی نہ ہو، دراصل یہ رویہ فقط معنی آفرینی کے لیے ہے نہ کہ منفیت کے لیے:۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(دیوانِ غالب کامل: ص ۳۲۹)

غالب نے اس شعر میں نفی کا تاثر ابھار کر قول محال قائم کیا ہے۔ شاعری میں سارا کمال انوکھی منطق اور دلیل لانے کا ہے جس میں غالب کو دستگاہ حاصل ہے۔ ہر انسان آزادی کا خواہاں ہے، قید اُس کے لیے باعث تکلیف ہے کیوں کہ قید آرام و سکون کی نفی کا نام ہے، لیکن غالب نے اِس تاثر کی نفی کی ہے اور جدلیات کی مدد سے معانی کو پلٹ دیا ہے، اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ قفس میں صیاد کا ڈر ہے نہ تیر

کا۔ دراصل غالب میں موجود عدم تقلید کا رویہ انہیں ایسی روش پر چلنے کو مجبور کرتا ہے جہاں ان کا سابقہ ان دیکھے معانی اور اَن سُنے حقائق سے ہوتا ہے۔ ذیل میں غالب کی ایک معروف غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جہاں اُن کا جدلیاتی و استفہامیہ طور عوام کی ذہنی سطح پر اترتا نظر آتا ہے:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیمروز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

(دیوانِ غالب کامل: ص ۲۵۲)

پوری غزل میں منفی تصور کی حامل ردیف 'کیوں' جدلیات کی حامل ہے۔ ہر شعر میں ایک تصور کے بیان کے بعد اُس کی نفی کر دی جاتی ہے جس سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ غزل مقبول اور ہر دل عزیز ہے تاہم اِس میں بھی غالب نے اپنی طبع کے مطابق پیچیدہ موضوعات کو پیش کیا ہے۔ جمال دل افروز اور صورت مہر نیم روز کا خود ہی نظارہ سوز ہونا اور حیات کو بندِ غم کے مماثل قرار دینا حاصل کلام ہے جو قاری کو فکری سطح پر جا کر متاثر کرتا ہے۔ دیوان غالب اول تا آخر ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جس میں جدلیات نفی، استفہام، تشکیک اور ردّ در ردّ سے معنی آفرینی کے در وا ہوتے نظر آتے ہیں، جو مابعد جدید فکر سے بہت قریب ہیں۔ یہ تمام اشعار اِس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ غالب قبل جدیدیت کے دور میں ہونے کے باوجود مابعد جدید ذہن کے حامل تھے۔ مزید اشعار ملاحظہ ہوں:

بہ رنگ شیشہ ہوں یک گوشہ دل خالی — کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے

(دیوانِ غالب کامل: ص ۳۶۰)

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں — گلدستہ نگاہ سُویدا کہیں جسے

(دیوانِ غالب کامل: ص ۱۹۹)

نفی سے کرتی ہے، اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

(دیوانِ غالب کامل: ص ۲۱۷)

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

(دیوانِ غالب کامل: ص ۳۰۰)

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۰۹)

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۱۶)

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

(دیوانِ غالب کامل: ص۳۸۰)

مرزا غالب کے ہاں اکہرے، واضح اور برملا اظہار بیان پر تکیہ نہیں کیا گیا۔ ان کے ہاں تقریباً ہمیشہ براہ راست کلام کی نفی ملتی ہے، سوائے استثنائی صورتوں کے۔ بقول اُسلوب احمد انصاری:

> "یہ امر بدیہی ہے کہ وہ (غالب) اس امر کا بہ خوبی احساس رکھتے تھے کہ براہ راست گفتگو میں شاید ولطف اور نُدرت نہیں جو پُر پیچ محاورہ سخن میں ہے کیوں کہ موخر الذکر قاری کے ذہن اور حسیت کو بہتر کرتا اور اُسے بندھے ٹکے جوابی تاثرات یعنی (Stock Responses) سے باز رکھتا ہے..... غالب کے ہاں فکر کے متضاد دھارے آکر مل گئے تھے اور خود ان کا مزاج لطافت، دور رسی اور ہمہ جہتی کے امتیازات سے متصف تھا، لہٰذا اُن کے ہاں الفاظ کے Tentacles کا پایا جانا محل حیرت نہیں ہے۔ عشقیہ محرکات سے سروکار کے دوران بھی انہیں یہ جستجو اُکساتی رہتی ہے کہ کائنات کی علت نمائی کیا ہے؟"[۱۴]

دیکھا جائے تو غالب کے ہاں جدلیات نفی مقصود بالذات نہیں۔ وہ اس کے ذریعے معنوی تعنیات کو ردّ کرتے ہیں، روش عام کو جبر کو توڑتے ہیں اور معنی کی طرفیں کھول کر یا جہان معنی کے نور سے قاری کی نظروں کو خیرہ کرتے ہیں۔ ان کی تفہیم کوئی آخری تفہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی تشکیک، استفہام اور جدلیاتی وضع سے آثار و ظواہر اور تعینات کو ردّ کرتے ہیں تو ان کا مقصد ان کے استرداد کے بعد متبادل بیانیہ فراہم کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف رد کرکے، مرکز شکنی کرتے ہیں اور حقیقت کا دوسرا رخ پیش کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مسائل کا حل اور متبادل مرکزی بیانیہ کی فراہمی مہابیانیہ کی تشکیل کا عمل ہے جو کہ غالب اور مابعد جدیدیت، ہر دو کے قریب درست طریقہ نہیں ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر، شعور اور لاشعور کا شاعر غالب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ۳۸۱۔

۲۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، افکار غالب (لاہور: مکتبہ معنی الادب، ۱۹۴۳ء)، ۷۲۔

۳۔ اسلوب احمد انصاری، غالب؛ جدید تنقیدی تناظرات (نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۴ء)، ۲۴۲۔

۴۔ ناصر عباس نیر، متن، سیاق اور تناظر (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ۲۳۸۔

۵۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات (نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۲۰۱۳ء)، ۹۷۔

۶۔ نظام صدیقی، ما بعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک (لاہور: کتابی دنیا، ۲۰۲۱ء)، ۵۳۔

۷۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، ۴۸۔

8. George Wilhem Fridrich Hegal, *THE SCIENCE OF LOGIC*, edited/translated: Geoarge di Giovanni (New York: Cambridge University Press, 2010), 98.

۹۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، غالب؛ معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، ۵۸۔

۱۰۔ مقالے میں شامل غالب کے تمام اشعار دیوان غالب کامل ہی سے لیے گئے ہیں۔
غالب، دیوانِ غالب کامل، مدوّنہ: کالی داس گپتا رضا (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۲ء)، ۱۵۵۔

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری، غالب؛ جدید تنقید ی تناظرات، ۲۳۹۔

۱۲۔ ناصر عباس نیر، متن، سیاق اور تناظر، ۲۳۹۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ اسلوب احمد انصاری، غالب؛ جدید تنقید ی تناظرات، ۱۵۲-۲۵۲۔